انتقاد

(انتقاد کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

چند معاشی مسائل اور اسلام || مصنف سید یعقوب شاہ۔ سابق آڈیٹر جنرل پاکستان۔ ناشر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

"چند معاشی مسائل" جن پر زیرِ نظر کتاب میں بحث کی گئی ہے، الربوا، بیمہ اور زکوٰۃ ہیں۔ الربوا پر تو مفصل بحث ہے، جو کتاب کے ۲۱۰ صفحات پر ممتد ہے۔ اور بیمہ اور زکوٰۃ پر بحثیں مختصر ہیں۔

ہم مسلمانوں کی آج کی معاشی زندگی میں الربوا کے سوال نے بڑی اہمیت اور وسعت اختیار کر لی ہے، اور انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ہم میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی شکل میں آئے دن اس سوال سے سابقہ پڑتا ہے۔ جناب سید یعقوب شاہ صاحب نے اس کتاب میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس اہم اور ہمہ گیر سوال کا جواب دینے کا محرک محض کسی نظری بحث کا شوق نہ تھا، بلکہ خود مصنف کی اپنی ایک عملی ضرورت اور اُن کا اپنا ذاتی مسئلہ تھا۔ جسے وہ اپنی ضمیر کی روشنی میں اسلام کی رُو سے حل کرنا چاہتے تھے۔ موصوف کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔ "جب میرا پنشن لینے کا وقت آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا عمر بھر کا اثاثہ پراوی ڈنٹ فنڈ کی شکل میں ہے۔ اور اس میں ایک کثیر رقم سود کی شامل ہے۔ چنانچہ مجھے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ رقم میرے لئے حلال ہے یا حرام"

اس بارے میں جب مصنف نے علماء کرام کی طرف رجوع کیا تو "اُن میں سے اکثر نے

اُسے حرام بتایا، لیکن دو نے جنہیں برصغیر پاکستان و ہند میں بڑی منزلت حاصل ہے، اُسے جائز قرار دیا۔ ایک صاحب نے لکھ کر اور دوسرے نے زبانی "قدرتاً" مصنف کی یہ خواہش تھی کہ انہیں اس جواز کے وجوہ بھی بتائے جاتے۔ لیکن اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس پر وہ لکھتے ہیں کہ میں نے "خود مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جو کتابیں اور مضامین میری نظر سے گزرے، اُن سے میری تسلی نہ ہو سکی۔ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا ہر قسم کا سُود جو آج کل رائج ہے "الربوٰ" کے تحت آتا ہے۔ اور اس لئے حرام ہے۔ یا اس کی کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں، جن پر "الربوٰ" کا اطلاق نہیں ہوتا اور جن سے مسلمان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی میدانوں میں مسلمانوں کی پس ماندگی سے متاثر ہو کر کئی اصحاب نے اس مسئلے کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سعی بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔"

اس سلسلے میں دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مصنف تمام عمر اُمورِ مالیات سے متعلق رہے۔ اور آخر میں وہ مملکتِ پاکستان کے مالیات ہی کے ایک اہم شعبے کے سب سے بڑے منصب سے ریٹائر ہوئے، پھر شروع ہی سے اُنھیں مذہب سے دلی شغف اور مذہبی مطالعہ کا شوق رہا، اور علماء کرام سے بھی اُن کو ہمیشہ عقیدت رہی۔ غرض مصنف ماہر مالیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی آدمی بھی ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے پیشِ نظر معاشی مسائل پر ان دونوں اعتبار سے بحث کی ہے۔ مصنف کی ان ذاتی خصوصیات نے، موصوف نے الربوٰ وغیرہ کے بارے میں اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اُسے ایک خاص اہمیت دے دی ہے، اور اس مسئلے پر جو کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں، ہمارے نزدیک زیرِ نظر کتاب کو یقیناً ان میں ایک ممتاز جگہ ملے گی۔

مصنف نے سب سے پہلے قرآن میں "الربوٰ" کا جو ذکر آیا ہے، اُس کے مفہوم کے صحیح تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بزرگانِ دین نے تقویٰ کے خیال سے اور اُس سخت وعید کے پیشِ نظر جو "الربوٰ" کھانے والوں کے لئے قرآن میں آئی ہے، ربوٰ میں ہر قسم کے منافع کو شامل کر دیا، اور اس طرح رباء اور سود کو متبادل الفاظ سمجھ لیا گیا، جو صحیح نہیں۔ مصنف کے نزدیک "فقہاء یہ مانتے ہیں کہ مالی معاملات میں اصل شے اباحت ہے، اس لئے جب تک حرمت مشکوک ہو، ممانعت میں سختی بے جا ہوگی۔" نیز سود کی حُرمت معلّل ہے۔ اور اس کی تائید میں وہ مولانا ظفر احمد تھانوی کی کتاب سے یہ اقتباس دیتے ہیں: "جملہ ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ ربوٰ کی

حرمت معلل (یعنی اس کی کوئی علت ضرور ہے)۔ اس میں بجز اہلِ ظاہر کے کسی کو اختلاف نہیں"۔
اب سوال یہ ہے کہ حرمت کی علت کیا ہے؟۔ مصنف نے مولانا تھانوی ہی کی کتاب سے یہ حوالہ دیا ہے:۔ "قاضی ابنِ رُشد" بدایۃ المجتہد" میں فرماتے ہیں:۔ ربٰو کے حرام کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ربٰو میں بہت ظلم ہے"۔

اس کے بعد مصنف نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:۔ "کسی طرزِ معاملہ کو حرام قرار دینے سے پہلے ہمیں کم از کم اس بات کی تسلی کر لینا چاہیئے کہ اس میں علت حرمت موجود ہے لیکن ہمارے بزرگانِ دین نے سُود کی ہر قسم کو ممنوع کر دیا ہے، چاہے اس میں ظلم کا احتمال غالب ہو یا نہ ہو"۔

اس تمہید کے بعد مصنف اصل مسئلہ پر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک قرض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صرفی اور دوسرا پیداواری۔ صرفی قرض وہ ہے جو احتیاجِ زندگی پورا کرنے کے لئے لیا جاتا ہے۔ اور پیداواری قرض سے اُن کی مُراد اُس قرض سے ہے جسے استعمال کر کے مزید دولت پیدا کرنے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ آخر الذکر قرض کی مثال وہ یہ دیتے ہیں:۔ کسی کے پاس ایک کارخانہ ہے، وہ ایک لاکھ روپیہ قرض لے کر اُس میں ایک اور مشین لگاتا ہے جس سے اُس کی آمدنی بڑھ جانے کی توقع ہوتی ہے۔

جہاں تک صرفی یعنی احتیاجی قرض کا تعلق ہے اُس پر کسی قسم کا سُود لینے کی مصنف نے بار بار مذمت کی ہے، لکھتے ہیں:۔ "قرض اگر احتیاجی و صرفی ہو تو اس پر سُود نہ ہونا چاہیئے۔ بلالحاظ اس کے کہ وہ قرض حکومت کے بنک سے لیا جائے۔ یا کسی ادارے اور فرد سے لیا جائے۔ کیونکہ قرآن مجید کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ نادار اور حاجت مند افرادِ ملت کی اعانت بغیر اُجرت کے ہونی چاہیئے"۔ (صفحہ ۱۸۹)۔ اس سے کچھ آگے وہ لکھتے ہیں:۔ "مؤخر الذکر قسم کے قرضوں (احتیاجی) پر سُود چونکہ ظلم و غصب کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اکثر بنتا رہا ہے۔ اس لئے یہ ایک اخلاقی جرم ہے، جس کا سدباب قرآن پاک کو کرنا چاہیئے تھا، اور اُس نے کیا ہے۔ قرضِ حسنہ اور زکوٰۃ کا انتظام کر کے اُس نے نادار افرادِ ملت پر معاشی مظالم کے دروازے بند کر دیئے ....."

اور آخر میں سید یعقوب شاہ صاحب نے یہ رائے دی ہے:۔

"..... احتیاجی قرضوں پر سود بالکل ممنوع ہونا چاہیئے۔ قرض کی جن اقسام پر سود لینا ممنوع ہے، اُن کے واسطے حکومت کو خاص انتظام کرنا ہوگا۔"

یہ انتظام کمرشیل بنکوں یا امداد باہمی کے بنکوں کے ذریعہ ہو، یا اس مقصد کے لئے زکوٰۃ کی رقوم جمع کی جائیں۔

اب رہا پیداواری قرض پر سُود کا معاملہ، اس کے بارے میں مصنف نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اُن کے نزدیک الربوٰ جس کی حرمت قرآن میں آئی ہے، صرفی و احتیاجی قرض پر لیا جاتا تھا، پیداواری قرض کا اُس عہد میں رواج نہ تھا۔ خود اُن کے الفاظ میں، "ہماری تحقیق کے مطابق عرب جاہلیت میں ربوٰ کی جو صورت رائج تھی، وہ تجارت اور دوسرے نفع آور کاموں کے لئے غیر موزوں تھی یعنی اُس وقت ایسے کاموں میں سودی سرمایہ کے استعمال کا امکان نہیں ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو قرآن کی عائد کردہ حرمت کا اطلاق پیداواری سُود پر نہیں ہوتا ....." اس استدلال پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، مصنف نے اُن کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جاہلیت میں پیداواری سود کا رواج نہ تھا، اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ مروجہ پیداواری سُود میں وہی بُرائی موجود ہے جو عرب جاہلیت میں مروجہ سُودوں میں تھی، یعنی ظلم کا غلبہ، اُس وقت تک پیداواری سُود کی حرمت کا اثبات کرنا صحیح نہیں۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لئے پیداواری قرضوں کا نظام کس قدر ضروری ہے اور ان کے بغیر اس کی زرعی و صنعتی ترقی کبھی ہو ہی نہیں سکتی، مصنف نے اس پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ اُن کے نزدیک پیداواری قرضوں پر جو سُود لیا جاتا ہے، اُس میں چونکہ ظلم کا پہلو نہیں ہوتا، اس لئے وہ ربوٰ کے حکم میں نہیں آتا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں: "..... جب حکومت قرض لیتی ہے یا ایک کارخانہ دار سرمایہ قرض لے کر اُسے نفع آور کاموں میں لگاتا ہے تو اس پر کس طرح سے ظلم ہوتا ہے، حکومت کو کم سے کم شرح سود پر روپیہ مل جاتا ہے اور قرض کی ادائیگی بھی وہ اپنی سہولت سے کرتی ہے۔ سُود ادا کرنے کے لئے روپیہ بھی افرادِ ملّت کی جیب سے آتا اور سُود کا روپیہ بھی افرادِ ملّت کی جیب میں جاتا ہے۔ شائد اسی بناء پر مولوی عبدالحئی صاحب فرنگی محلی نے سرکاری پرامیسری نوٹوں پر سُود کو جائز قرار دیا تھا۔ اسی طرح جو روپیہ نفع آور کاموں میں لگا ہوتا ہے، وہ اپنا سُود آپ کماتا ہے۔ اور قرض لینے والے پر بار نہیں ہوتا ....."

اس ساری بحث کے بعد مصنف نے آخر میں جو نتیجہ نکالا ہے، وہ حسب ذیل ہے:-

"ہمارے نزدیک اسلام پیداواری اور ریاستی سُود کو حرام قرار نہیں دیتا، مگر اس کی تعلیمات برادری و برابری کے پیشِ نظر یہ بہتر ہوگا کہ بے محنت کی آمدنی کے تمام ذرائع سے پرہیز کیا جائے۔ اور اُن پر قید لگائی جائے۔ اس میں سُود..... صفِ اوّل میں آتا ہے۔ اس لئے اس سے نجات حاصل کرنے کے طریقے سوچنے چاہئیں..... لیکن جب تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، ریاستی اور پیداواری سُود کی ممانعت نہ ہونی چاہیئے۔"

کیونکہ ترقی پذیر ملکوں کے لئے سرمایہ حاصل کرنا بے حد ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ کبھی زرعی، صنعتی اور تمدنی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ یہ سرمایہ نہ تو خارج سے اور نہ اندرونِ ملک سود کے بغیر، جسے وہ پیداواری قرض کا سود کہتے ہیں، فراہم نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس قسم کے سود کی آج مخالفت کرتے ہیں، وہ دراصل ان ملکوں کو پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ رکھنا چاہتے ہیں۔

نظام بنک کاری پر مولانا مودودی نے جو اعتراضات کئے ہیں، مصنف نے اُن پر بھی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس نظام پر اعتراض کا عملی پہلو یہ ہے کہ اُس کا انحصار سودی کاروبار پر ہے، اور اس کا مداوا یہ تجویز کیا گیا ہے کہ شرکت کے ذریعہ بنکوں کا کاروبار ہو، لیکن اس صورت میں بھی ان بنکوں پر چند ساہوکار چھا سکتے ہیں۔ مولانا مودودی اس خطرے کا تدارک یوں کرنا چاہتے ہیں کہ مرکزی ساہوکاری کا سارا اختیار بیت المال یا سٹیٹ بنک کے ہاتھ میں ہو۔ مصنف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا نے بنک کاری کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا ہے، اُن کو دُور کرنے کا خود ہی اُنہوں نے طریقہ بتا دیا، اس لئے یہ خدشات بے محل ہو جاتے ہیں اور یوں بھی بقول مصنف کے اس کا سہل علاج یہ ہے کہ بنک کاری کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔

نظام بنک کاری کے خلاف مولانا مودودی نے بہت کچھ لکھا ہے اور ایک موقع پر بنک کی نوکری کو شراب خانے یا قحبہ گری کی نوکری کا مثل بتایا ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مولانا اور اُن کے ہم خیالوں کے لئے خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"بنک ایک مفید خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور اس طریقہ کار میں جو عملی نقص ہے، یعنی اجتماعی دولت کا چند ہاتھوں میں مرتکز ہونا، وہ شرکت کی صورت میں بھی رہے گا اور جو

علاج اس صورت میں تجویز کیا جا رہا ہے اُسے موجودہ صورت میں بھی کارگر ہونا چاہیئے ....."

بیمہ کے بارے میں مصنف نے مختصراً بحث کی ہے۔ اُن کے خیال میں بیمہ کو جُوا کے حکم میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس میں نہ بیمہ کرانے والوں کو نقصان ہوتا ہے اور نہ بیمہ کرنے والی کمپنیوں کو۔ خود اُن کے الفاظ میں، "ربوا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں ظلم کا قوی احتمال ہے۔ جُوا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں فریقین کے درمیان صحیح تعاون نہیں ہوتا اور اس سے کینہ و عداوت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غفلت پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ بیمہ سے نہ کسی فریق پر ظلم ہوتا ہے نہ اس سے کینہ و عداوت پرورش پاتے ہیں..... اس میں صحیح تعاون بھی موجود ہے ..... عصرِ حاضر میں اس کے بغیر کامیاب تجارت و صنعت ممکن ہی نہیں۔ ان سب خوبیوں کے باوجود اگر ہمارے علماء کرام بیمہ کو ممنوع قرار دیتے ہیں، تو یقیناً اُن کو اس ممانعت کی تائید میں قوی قطعی اور ناقابلِ تردید دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

بدقسمتی سے ہمارے بہت سے علماء اور بالخصوص مولانا مودودی بیمہ کو بھی شرعاً ناجائز سمجھتے ہیں۔ مصنف نے اس بارے میں اُن کے اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایسے معاملات میں شریعت کے اس اُصول، جلبِ مصالح اور دفعِ مفاد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ بیمہ میں اگر نقصان کا احتمال ہے تو بہت ہی کم۔ اور اس کے مقابلے میں فائدہ بہت زیادہ ہے۔

سید یعقوب شاہ صاحب نے کتاب کے آخری حصے میں زکوٰۃ کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ بحث اُٹھائی ہے، جس کی اس وقت بہت زیادہ نشر و اشاعت کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج اس مسئلے کا تعلق افراد سے بھی ہے اور حکومت سے بھی۔ سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنی مسلمان رعایا سے جو انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکس وصول کرتی ہے، کیا یہ زکوٰۃ کے تحت نہیں آجاتے۔

اس سلسلے میں مصنف نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "زکوٰۃ کی نوعیت عام خیرات کی سی نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے پورے معنوں میں ایک انکم ٹیکس ہے۔" زکوٰۃ اور انکم ٹیکس میں مولانا آزاد کے نزدیک فرق یہ ہے زکوٰۃ اپنی نوعیت میں زیادہ وسیع ہے، دوسرے اس کے مصارف معین ہیں۔ اور "سٹیٹ کو حق نہیں کہ ان مصارف کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں صرف کرے۔" بہرحال ان مصارف کی تعبیر و تشریح کا دروازہ تو کھلا ہے، چناں چہ اُن کے تحت ہر نیا مصرف آجاتا ہے، یا لایا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں مصنف کے سامنے جو اصل سوال ہے، وہ اُسے یوں پیش کرتے ہیں:-

حکومت اس وقت بھی بہت سے محاصل وصول کر رہی ہے، جو زکوٰۃ کے ذیل میں آتے ہیں مثلاً زمین پر لگان یا معاملہ۔ دوسری طرف حکومت دفاع اور رفاہِ عامہ کے کئی ایسے کام کر رہی ہے جو مصارفِ زکوٰۃ میں شامل ہیں۔

جب یہ صورت ہے تو مصنف کے نزدیک ایک ٹیکس دینے والے کو اُس کے ذمہ زکوٰۃ کی جو رقم واجب الادا ہو، اُس میں اِسی حساب سے یقیناً اُسے چھوٹ ملنی چاہیئے۔ لیکن اس کا حساب کیسے کیا جائے، اس سلسلے میں مصنف نے جو طریقہ بتایا ہے، وہ خاصا پیچیدہ ہے، اس لئے ناقابلِ عمل ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے: ٹیکس دینے والا اپنے ادا کردہ ٹیکس اور اُس میں مشمولہ رقم زکوٰۃ سے حکومت کو مطلع کرے..... ایسی اعلان کردہ رقوم کو ایک طرف جمع کر لیا جائے اور دوسری طرف ان سب مدات کے خرچ کو جمع کر لیا جائے جو مصارفِ زکوٰۃ ہیں۔ اگر موخر الذکر زکوٰۃ کی رقم کے برابر یا اس سے زائد ہو تو ٹیکس دہندگان کو مزید زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن اگر کم ہو مثلاً اسّی فی صد کے برابر ہو تو حکومت کو اعلان کرنا ہوگا کہ زکوٰۃ کا ۱/۵ حصہ زکوٰۃ دینے والوں کے ذمہ رہ گیا ہے، وہ اُسے خود ادا کر دیں۔

حکومت پر جو بے شمار ذمہ داریاں ہیں، اور اُن سے عہدہ برآ ہونا ہی اُس کے لئے انتہائی مشکل ہے، اِس پر اُس کے سُپرد یہ پیچیدہ ذمہ داری کرنا اَن ہونی سی بات نظر آتی ہے۔ اور یہ بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔ اس کے بجائے کیوں نہ زکوٰۃ کو اسلامی حکومت کا ایک ٹیکس قرار دے دیا جائے، اور جب ایک مسلمان اپنی اسلامی حکومت کے ٹیکس ادا کر دے، تو وہ یہ سمجھ لے، کہ میں فریضہ زکوٰۃ سے سبک دوش ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف معین ہیں، اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، تو جہاں تک دفاع اور رفاہی محکمہ جات کے خرچ کا تعلق ہے، تو وہ ان مصارف کے تحت بآسانی آجاتا ہے۔ باقی اس طرح کے اعتراض کہ غنی کو زکوٰۃ نہیں مل سکتی۔ اسی طرح آلِ ہاشم یعنی سادات اور غیر مُسلم کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں۔ لیکن حکومت کی نوکری اور اداروں سے امیر و غریب، سید و غیر مسلم سب یکساں مستفید ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر زکوٰۃ کے لئے تملیک ذاتی ضروری ہے۔ اور دفاع اور رفاہی اداروں کے بیشتر خرچ میں یہ شرط پوری نہیں ہوتی۔

مصنف نے ان سب اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ اور اُن کی تائید میں مستند حوالے بھی پیش کئے

ہیں۔ مصنف کی اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عملاً انکم ٹیکس کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ اُس کے تحت زکوٰۃ آجاتی ہے۔ نیز آج سے کئی سو سال پہلے احکام زکوٰۃ کی جو صورت تھی، ضروری نہیں کہ اس طویل عرصے میں ہمارے معاشرے میں جو بے شمار تغیرات آچکے ہیں، اُن کے پیشِ نظر ان احکام زکوٰۃ کی نئی تعبیرات نہ ہوں۔

زکوٰۃ کے اس مبحث کو مصنف یوں ختم کرتے ہیں :۔

(۱) جیسا مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے فرمایا ہے، زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے۔ یہ اس لئے عائد کیا گیا ہے کہ ایک صالح حکومت اپنی اہم مالی ضروریات کو پورا کر سکے اور زندہ رہ سکے۔ اسے عبادات میں شامل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس کی ادائی میں حیلہ بہانہ نہ کریں اور اپنا فرض دینی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھ کر اسے برضا و رغبت ادا کرتے رہیں۔ اُس کے مصارف مقرر کر دینے کا مقصد جہاں ایک طرف یہ ہے کہ اربابِ اقتدار اسے فسق و فجور..... جیسے غیر اسلامی کاموں پر صرف نہ کر سکیں۔ وہاں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ حکومت پر بعض ایسی ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں جنہیں پہلی حکومتوں نے کبھی اپنایا نہ تھا۔ مثلاً فقراء و مساکین کی خبر گیری کو شاید قرآن پاک ہی نے دنیا میں سب سے پہلے آئینی حیثیت دی ہے۔

(۲) بعض اصحاب کہتے ہیں چوں کہ ہمارے ملک اسلامی قانون نافذ نہیں ہے۔ اس لئے جو محاصل ہماری حکومت وصول کرتی ہے، اُنہیں زکوٰۃ میں مجرا نہیں کیا جا سکتا۔ گو مماثلت مکمل نہیں تاہم بنو اُمیہ کے بارے میں علماء کے فیصلے سے ہم سبق لے سکتے ہیں (تمام صحابہ نے فیصلہ کیا تھا کہ زکوٰۃ بنو اُمیہ کو دینی چاہیئے) خواہ وہ جبر و تشدد ہی کیوں نہ کریں اور زکوٰۃ کے مال کو اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کریں۔

اب اگر زکوٰۃ کی انکم ٹیکس کی حیثیت تسلیم کر لی جائے، اور لوگ انکم ٹیکس فرض دینی سمجھ کر دیں، تو ایک طرف جہاں انکم ٹیکس کی ادائی میں گڑبڑ کے امکانات کم ہو جائیں گے، وہاں رائے عامہ کا دباؤ حکومت کو مجبور کر دے گا کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود میں زیادہ دلچسپی لے۔ یہ زمانہ شخصی بادشاہتوں کا نہیں کہ اُن کی دست بُرد سے اموالِ زکوٰۃ محفوظ رکھنے کے لئے فقہاء احکام بنائیں اور تدبیریں سوچیں۔ یہ نمائندہ حکومتوں کا عہد ہے۔ اور حکومتیں روز بروز عوام کے سامنے زیادہ سے زیادہ جواب دِہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومتوں کو دیا جائے، اور

ٹیکس کے قبیل کے تمام واجبات زکوٰۃ کے حکم میں آجائیں تو اسلامی ملکوں میں صحیح جمہوری اور فلاحی مملکتوں کا قیام زیادہ آسان ہو جائے گا۔

باقی رہا اپنی مرضی سے اور خود تکلیف اُٹھا کر خیرات و صدقات کی مد میں صرف کرنا، تو اس پر تو ہر مذہب زور دیتا آیا ہے، اور اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن اس طرح خرچ کرنے کی نوعیت دوسری ہے، اور یہ زکوٰۃ کے تحت نہیں آتا۔

سید یعقوب شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اسلامی ذہن کو اس نہج پر سوچنے کی طرف راغب کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم معاشی مسائل کو آج کی زندگی کی ضرورتوں کے تحت حل نہیں کریں گے۔ ہمارا معاشرہ پس ماندگی، اور جمود سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اس سلسلہ میں مصنف نے بڑی جرأت سے اپنے افکار کا اظہار کیا ہے، اور گو اُن کی شدید مخالفت ہوگی۔ لیکن اس سے یقیناً سوچ بچار کی نئی راہیں کھُلیں گی۔ اور لوگ آزادی سے ان مسائل پر غور کرنے لگیں گے۔

کتاب مجلد ہے، صفحات ۲۶۰۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۶/۵۰ روپے، عام ایڈیشن ۵ روپے۔

(م۔س)

طابع: ظہیر الدین — مطبع: استقلال پریس لاہور
ناشر: ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان